تعلیم بالغان کا ایک اور مرحلہ:

پاکستان ایڈمنسٹریٹو سٹاف کالج کا چار ماہ کا مینجمنٹ کورس وہ مرحلہ ہے جس سے نپٹے بغیر کوئی سرکاری ملازم اپنی ملازمت کے اکیسویں گریڈ میں قدم نہیں رکھ سکتا۔ لہٰذا پوسٹل کارپوریشن کی جانب سے ہمیں اور ہمارے دوست ضیاء الرحمٰن کو یکم اگست 1993ء سے شروع ہونے والے کورس میں شرکت کیلئے لاہور جانا پڑا۔ مال روڈ پر واقع اِس اہم ترین تربیت گاہ کی ایک تاریخی اہمیت یہ ہے کہ تقسیمِ برصغیر سے پہلے اِس عمارت میں مشہورِ زمانہ پنجاب کلب تھا جہاں فرنگی سامراج نے ایک بورڈ آویزاں کر رکھا تھا جس پر تحریر تھا ''یہاں کُتوں اور دیسی باشندوں کا داخلہ ممنوع ہے۔'' یہ وہی مقام تھا جہاں 11 اپریل 1919ء کو امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں آزادیٔ ہند کے متوالوں پر گولیاں برسانے والے انگریز خونخوار جنرل ڈائیر نے خون کی ہولی کھیلنے کے بعد آ کر مے نوشی فرمائی تھی اور پھر پاکستان بننے کے بعد ستمبر 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے موقع پر بھارتی فوج کے سورماؤں نے دونوں ممالک کے درمیان حائل حدِ فاضل بی آر بی کینال پار کرنے کے بعد یہیں آ کر لاہور کی فتح کا جشن منانے کا اِعلان کیا تھا ۔لیکن نہ وہ ایسا کر پائے اور نہ اب اِس جگہ پنجاب کلب تھا۔

اِس کورس میں ہم دو نامہ بروں کے علاوہ چار پولیس افسر (مسعود شاہ۔ سعد شریف، مُحب اسد اور اِسرار شنواری) وفاقی اور پنجاب سیکریٹریٹ میں کام کرنے والے تین ڈسٹرکٹ مینجمنٹ گروپ سے تعلق رکھنے والے افسران (غلام محمد تاج، نوید احسن اور یوسف کمال)۔ وفاقی محتسب کے سیرت علی شیخ، وفاقی سیکرٹریٹ کے ایک اور افسر جاوید بٹ۔ تین عدد انجینئر صاحبان (ریلوے کے بشیر احمد، پلاننگ کمیشن کے ملک سعید خان اور پاک پی ڈبلیو ڈی کے محمد ریاض خان)۔ انٹیلی جنس بیورو کے احمد عبدالحق۔ پاکستان کسٹمز کے عطاء اللہ، انکم ٹیکس سروس سے کمشنر عہدے کے سات افسران (سکندر کلیم فضل، محمد محبوب عالم، عبدالرحمٰن آفریدی، آفتاب اقبال راٹھور، شارق محمود، حمید اللہ ملک، مجاہد بلوچ) آڈٹ اور اکاؤنٹس کی مسز سُنبل نذر شیخ) شامل تھے۔ ہمارے اِن سب ذہین و فطین دوستوں کی رفاقت ہم زندگی بھر نہیں بُھلا سکتے۔ اِن سب نے بعد ازاں اپنے اپنے شعبہ میں اعلیٰ ترین مدارج کو چُھوا اور مُلک و قوم کی خدمت میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ لیکن اُن چار مہینوں کے دوران تو ہم سب ایک ہی کمرۂ جماعت کے ساتھی تھے اور مُلکی و غیر ملکی مسائل کی گھتیاں سُلجھانے کی خاطر علم و عرفان کے چشموں سے اپنے اپنے ظرف کے مطابق سیراب ہوتے تھے۔

لاہور کے مقامی افسران کے علاوہ سب ہی کالج کی رہائش گاہ میں مقیم تھے۔ دِن بھر اپنے ادارے کے اساتذہ یا باہر سے آنے والے ماہرین کی عالمانہ گفتگو اور تجربوں سے فیض یاب ہوتے رہتے تھے۔ شام کو مختلف کھیلوں سے لطف اندوز ہوتے۔ رات کو اساتذہ کی جانب سے تفویض کردہ کام کی تیاری کے سلسلے میں مصروفِ مطالعہ ہوتے۔ ایسی ہی ایک رات کوئی ڈیڑھ بجے دوسری منزل پر واقع ہمارے کمرے کے دروازے پر ہم نے دستک سنی۔ ہم نے خوابیدہ آنکھوں سے دروازہ کھولا تو سامنے سکندر کلیم کو پایا جو رات کے اِس پہر ہمیں نہایت معذرت خواہانہ انداز میں بتا رہے تھے کہ گذشتہ چند گھنٹوں سے وہ اپنے قیمتی سرمایہ اُردو غزلیات کی محفوظ شدہ ٹیپس میں سے تاریخی مواد سُن رہے تھے کہ اُنہیں ایک انتہائی انمول خزانہ مِل گیا۔ اب ہم حیران تھے کہ سکندر صاحب کے اِس انمول شوق کے متعلق تو ہم سن چکے ہیں لیکن کبھی اِس موضوع پر ہماری اُن سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ ہماری پریشانی تاڑتے ہوئے سکندرِ وقت فرمانے لگے۔ ”دراصل آپ کے دوست ضیاء الرحمٰن سے میں نے شہنشاہ اورنگزیب کے دربار میں کجن بیگم کی پردادی کی گائی ہوئی غزل کا ذکر کیا تھا۔ اُن کا دروازہ میں نے کھٹکھٹایا لیکن جواب ندارد۔ آپ سے گذارش ہے کہ اُنہیں جگانے میں میری مدد فرمائیں۔ میری یہ دریافت بڑی تاریخی اہمیت کی ہے۔ دِل ہی دل میں لاحول پڑھتے ہوئے ہم اُن کا دل رکھنے کی خاطر نیچے آئے اور اُن کی خوشیوں میں شریک ہوئے۔

ہر صبح آدھ گھنٹہ کے لئے قرآنی آیات کی تفسیر پر گفتگو ہوتی لہٰذا اِس سلسلے میں ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق کورس کے مختلف شرکاء تفسیر کی کتابوں کو چھان کر موضوع کے متعلق تمام ضروری معلومات جمع کر لیا کرتے تھے۔ مشہور یہ تھا کہ ہمارے ایک ساتھی جو پولیس جنرل تھے نے یہ فرض اپنے ایک اور رفیق کار کو سونپ رکھا تھا جو ملازمت کے دوران اُن کے نائب تھے۔ اُس بچارے کے ذمہ صرف یہی نہیں تھا بلکہ حُکمِ حاکم یہ تھا کہ وہ اُن کے ایک انجینئر دوست کی باری پر بھی اُن کی تقریر ضبطِ تحریر میں لائیں گے۔ یہ راز سب ساتھیوں پر افشا تھا۔ لہٰذا موضوع کے متعلق سوالات بھی ڈپٹی انسپکٹر جنرل سے براہ راست کئے جاتے تھے اور کالج کے پرنسپل (ڈائریکٹر صاحب) جو خود ایک پولیس افسر تھے۔ اپنے دفتر میں بیٹھے بیٹھے جدید آلاتِ سماعت کے ذریعے ہماری کلاس کی ساری کارروائی سُن رہے ہوتے تھے۔

فرصت میسر آتی تو دوستوں کے ساتھ شعر و شاعری اور ادب کے متعلق بھی گفتگو ہو جاتی اور لطیفہ بازی کی محفل بھی جم جاتی۔ ایک روز انجینئر ریاض خان اپنے ضلع مانسہرہ کے دیہی علاقے کے باسیوں کی سادہ لوحی

پر بات کرنے لگے۔فرمانے لگے " میرے گاؤں کے قریبی پہاڑی جنگل میں ایک عدد سرکاری ریسٹ ہاؤس واقع ہے جہاں ایک روز مجھے بھی قیام کرنا پڑا۔ میں نے چوکیدار سے غُسل خانے سے غائب کموڈ کے بارے میں پوچھا۔تو اُس نے بتایا کہ وہ کموڈ تو چوری ہوگیا ہے۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ چند روز بعد میں نے اِخبار میں پڑھا کہ مقامی پولیس نے ریسٹ ہاؤس کے قریب سے گذرنے والی سڑک کے کنارے واقع ایک دیہاتی ریستوراں سے گُم شدہ کموڈ برآمد کرلیا۔ جو چوری کرنے والے نے وہاں بیچ دیا تھا''۔''چلو اچھا ہوا ریستوراں والے بھی کموڈ کو اُسی مصرف میں لا رہے ہوں گے''۔ایک ساتھی نے کہا۔''نہیں ایسی بات نہیں تھی''۔ریاض صاحب بولے۔''ریستوراں والے اِس میں دَہی جما کر فروخت کررہے تھے''۔

شروع میں پرویز صاحب ہمارے ڈائریکٹر تھے۔وہ اچھے کرکٹر بھی تھے اور ہم میں سے شائقینِ کرکٹ کی حوصلہ افزائی بھی فرمایا کرتے تھے لہٰذا مشق کے لئے ہم پڑوس میں واقع ایجیسن کالج کے کرکٹ سٹیڈیم کو استعمال کرتے تھے۔اِس سٹیڈیم کے بارے میں عام تاثر یہ تھا کہ یہیں پر کھیلتے کھیلتے بے شمار ہونہار کھلاڑی بشمول عمران خان قومی اور بین الاقوامی سطح پر نام پیدا کر گئے۔لیکن یہ کہاں تھی ہماری قسمت!اب کافی دیر ہوچکی تھی۔ پرویز صاحب صوبہ پنجاب کے چیف سیکرٹری مقرر ہوئے تو اُن کی جگہ دنیائے فائیلٹلی کے سلمان قریشی آئے تو اِس تعلق سے وہ ہم نامہ بروں کی خصوصی سرپرستی کرنے لگے۔کیوں نہ ہو وہ ڈاک کے ٹکٹوں کے پرستاروں کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔لیکن اُن کی وجہ شہرت ایک اور بھی تھی۔وہ پاکستان کے نئے ماہر اقتصادیات وزیراعظم معین قریشی کے برادرِ خورد تھے۔ جناب معین قریشی قوم کی ناؤ پار لگانے کا عزم لیے پاکستان کے امریکہ سے خصوصی طور پر درآمد شدہ دوسرے وزیراعظم کی حیثیت سے یاد رکھے جائیں گے۔ جو اقوام متحدہ کی نہایت پرکشش ملازمت چھوڑ کر پاکستان تشریف لائے تھے۔اِن سے قبل 1953ء میں محمد علی بوگرہ کو اِسی کام کے لیے لایا گیا تھا۔اِس پر بس نہیں۔اگست 2004ء میں شوکت عزیز اِس سلسلے کے تیسرے وزیراعظم کے طور پر یاد کیے جائیں گے۔بہرحال تیسری دنیا کے بے شمار دیگر ترقی پذیر ممالک کی طرح پاکستان میں بھی لنگڑی لولی جمہوریت کی گاڑی کو دھکا دینے کی خاطر اِن وزرائے اعظم اور امریکہ کی سپر طاقت کے نام اور کام کا جائزہ مستقبل کا مورخ ضرور لے گا۔

معین قریشی صاحب پاکستان کے اِس اعلیٰ ترین سول بیوروکریسی کے تربیتی ادارے میں بھی تشریف لائے۔اپنے ارشاداتِ عالیہ سے نوازا اور کورس کے شرکاء میں انعامات تقسیم فرمائے۔ہمیں بھی اُن سے ہاتھ

ملانے اور ایک عدد ٹرافی وصول کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ یہ نہ پوچھیے کہ یہ اعزاز کس سلسلے میں ملا کیوں کہ ایسی مہربانی سب دوستوں کے حصّے میں آئی اور ہمیں بیڈمنٹن میں اپنے جوہر دکھانے بلکہ سچ پوچھئے تو لاہور کی گرمیوں کی ایک شام بیڈمنٹن کورٹ میں پسینہ بہانے کی پاداش میں ہماری قدر افزائی فرمائی گئی۔ اِن چار مہینوں میں ہم سے ہمکلام ہونے اور ہمارا پُرانا سبق ہمارے ذہنوں سے محو کرنے کی کوشش میں حصہ لینے کی خاطر کئی نامور اور جیّد ماہرین سٹاف کالج تشریف لائے۔ ان میں ایک اُس وقت کے دینی امور کے جید عالم ڈاکٹر غلام مرتضٰی کا نام نامی سب سے پہلے یاد آتا ہے۔ اُن کے خطاب کے بعد کھانے کی میز پر ہمارے ایک دوست کے اِس سوال پر کہ ہمارے روایتی علماء کرام جدید دور کے تقاضوں سے پوری طرح آشنا نہیں ہیں اِس لیے اِن سے آج کے مسائل کے سلسلے میں کیسے راہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے؟ فرمانے لگے ''آپ لوگ گروہ دانشوران میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ کو چاہئے کہ وقت کے اِن بہروپیوں کو منبرِ رسولؐ سے اُتار کر خود اُن کی جگہ سنبھال لیں بشرطیکہ آپ رموزِ دین سے بھی کما حقہ آگاہ ہوں۔'' اِس روشن نظر عالمِ دین کو جلد ہی کسی کی نظر لگ گئی اور لاہور ہی میں ایک نامعلوم شخص کی گولی کا نشانہ بن گئے۔

ایک روز حقوقِ انسانی کی مشہور علمبردار خاتون رہنما محترمہ عاصمہ جہانگیر چند دیگر خواتین کے ہمراہ ایک پینل مباحثہ میں شرکت کیلئے سٹاف کالج آئیں۔ موضوع حقوقِ انسانی اور حقوق نسواں کے حوالے سے تھا۔ احمد عبدالحق نے پینل سے کوئی سوال پوچھا جس میں اُنہیں اپنی تضحیک کا پہلو نظر آیا اور محفل چھوڑ کر جانے کا عندیہ دیا۔ سوال کرنے والے معافی کے طلب گار ہوئے تو بات بنی۔ لیکن اِس واقعہ کو جس طور پر انجینئر ملک سعید خان نے شعر کا جامہ پہنایا اُس سے نہ صرف ملک صاحب کے منفی ادبی ذوق کی عکاسی ہوئی بلکہ کافی دنوں تک سارے کالج میں اُن کے بے ہنگم قافیہ اور ردیف پر مشتمل اشعار کی گونج سنائی دیتی رہی۔ جو سب کی تفننِ طبع کا باعث بنے سوائے احمد عبدالحق کے۔

نومبر کے آخری دنوں میں بیرونِ ملک مطالعاتی دورے کی تیاری ہونے لگی۔ تمام شرکاء کورس کو تین ٹولیوں میں بانٹ دیا گیا۔ ایک گروہ فرانس اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ۔ دوسرا وسط ایشیائی ممالک اور تیسرا جنوبی کوریا اور فیلی پائنز کے سفر پر نکلا۔ ہم تدریسی عملے کے وقار احمد صاحب کے ہمراہ مشرق بعید کی طرف چلے۔ کوریا اور فیلی پائنز میں چلنے والی مقامی حکومتوں کی کارکردگی کا جائزہ ہمارے مطالعہ کا موضوع ٹھہرا۔

جمہوریہ کوریا:

بکھری ہوئی قوموں اور تباہ شدہ مملکتوں کے تو نصیب ہی خراب ہوتے ہیں یہاں بھی شاید ایسا ہی ہوا ہو لیکن بظاہر جمہوریہ کوریا ایک مضبوط معیشت کے ساتھ مشرق بعید کی ایک انتہائی خوشحال آبادی کا وطن تصور کیا جاتا ہے۔ ہمارے گروپ میں وقار صاحب کے علاوہ آٹھ شرکاء کورس تھے۔ سیول کے ہوائی اڈے پر اُترے تو معلوم ہوا یہاں کے پاکستانی سفارت خانے کی طرف سے ہمارے لئے ہوٹل کا انتظام ایک نہایت مناسب مقام پر کیا گیا ہے جہاں پڑوس میں واقع مارکیٹ غیر ملکی باشندوں میں کافی مقبول ہے۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ اِس مارکیٹ میں دکانوں اور ہوٹلوں پر کام کرنے والوں کی اکثریت مقابلتاً بہتر طور پر انگریزی سمجھ لیتی ہے کیونکہ یہاں قریب ہی میں امریکی فوجیوں کا ایک بڑا کیمپ قائم ہے۔ یہ اور بات تھی کہ یہ فوجی عوام الناس میں کتنے مقبول تھے۔ اِسی علاقے میں سیول کا اِسلامی مرکز بھی واقع ہے اور ہماری مہمان داری کے لئے ایک پاکستانی ریستوراں بھی۔

سعد شریف اور ہم نے ایک ہی کمرے میں رہنے کو ترجیح دی۔ اُس نے کمرے کا تالا کھولتے ہی ایک جہاندیدہ پولیس افسر کی طرح آٹھویں منزل پر واقع ہمارے لیے مختص اس قیام گاہ کا جائزہ لیا۔ اُسے یہ کمرہ پسند نہ آیا اور دوبارہ استقبالیہ پر جا کر چوتھی منزل پر ایک اور کمرہ حاصل کر لیا۔ ہم نے وجہ پوچھی تو فرمانے لگے ''میری چھٹی حس نے مجھے بتایا کہ یہاں زلزلہ بھی آ سکتا ہے اور آگ بھی لگ سکتی ہے''۔ ''تو پھر ہم کیا کر سکتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔ ''ہم یہی کر سکتے ہیں جو میں نے کیا۔ کم از کم کھڑکی سے چھلانگ لگا کر جان بچانے کی کوشش تو ہو سکتی ہے''۔ ''ارے تم تو نِرے شاعر ہی نکلے آٹھویں اور چوتھی منزل میں اِس لحاظ سے کتنا فرق پڑ سکتا ہے؟'' ہم نے جواب دیا۔ واقعی کوئی دس سال بعد وہ ہم سے ملنے آیا تو اپنے ہاتھ میں اپنی شاعری کی کتاب کا مسودہ لئے ہوئے تھا۔ اور ہم سے پوسٹل فاؤنڈیشن کے پریس سے اُسے چھپوانے کے لئے کہا۔ ہم نے متعلقہ حضرات سے اُن کا تعارف کرایا بعد ازاں معلوم ہوا سعد صاحب بیک وقت چار کتابیں چھپوا بیٹھے ہیں۔

سیول کا تاریخی اور جغرافیائی پس منظر:

مختلف ادوار میں نام تو بدلتا رہا ہے لیکن یہاں کے باشندے اپنی تاریخ اٹھارہ قبل مسیح سے جوڑتے ہیں۔ کوریائی زبان میں سیول کے معنی ہی صدر مقام بتائے جاتے ہیں۔ ایک کروڑ آبادی کے ساتھ سیول

کوریا کا سب سے بڑا شہر ہے اور اگر سارے عظیم تر میٹروپولیٹن سیول کو لیا جائے تو پھر یہاں کی کُل آبادی 2 کروڑ 30 لاکھ بنتی ہے اور یوں یہ دنیا کا دوسرا بڑا گنجان ترین شہر ہے۔ معیارِ زندگی نہ صرف بلند ہے بلکہ روز بروز بلند تر ہونے کی آرزو میں بازار کے بھاؤ حقیقتاً آسمان سے باتیں کر رہے ہیں اور سیول کو دنیا کا تیسرا مہنگا ترین شہر سمجھا جاتا ہے۔ [1]

پڑوسی ملک جاپان کے ساتھ یہاں کے باسیوں کی تاریخی پرخاش ہے۔ جاپانی افواج نے بیسویں صدی کے اوائل میں نہ صرف اس علاقے کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا تھا بلکہ یہاں کا سب کچھ بدل کر رکھ دیا اور پھر وسط صدی میں کوریائی جنگ نے نہ صرف ملک کو شمالی اور جنوبی کوریا میں تقسیم کر دیا اور دو مختلف نظام ہائے معیشت میں بانٹ دیا بلکہ سیول کو تقریباً مکمل طور پر تباہ کر دیا تھا۔ لیکن اِس قوم نے ہمت نہ ہاری۔ اور ایک جارحانہ معاشی پالیسی کی بدولت ایک دو دہائیوں میں اپنی تقدیر بدل کر رکھ دی اور ہر شعبہ زندگی میں جاپان کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو گئی۔

انتظامی لحاظ سے سیول قومی حکومت کی زیرِ نگرانی ایک خصوصی شہر کے طور پر کام کر رہا ہے۔ سیول پچیس عدد ''گو'' یا اضلاع میں منقسم ہے۔ جو 522 ''ڈونگ'' پر مشتمل ہیں۔ جن کو 13787 ''ٹونگ'' میں تقسیم کیا گیا ہے اور اُنہیں مزید 102,796 ''بان'' میں بانٹا گیا ہے۔ ہمارے سیول میں قیام کے دوسرے دن کی مصروفیتوں میں اِس عظیم الشان شہر کے منتخب میئر سے ملاقات تھی۔ ہم لوگ اُن کے دفتر میں پہنچے تو ہر کسی کو یوں نئے نویلے لباس میں ملبوس دیکھا گویا یہ سب خواتین وحضرات شادی کی کسی تقریب میں تشریف لائے ہیں لیکن نظم وضبط ایسا کہ گویا ہم عوامی نمائندوں کے ہاں نہیں بلکہ کسی فوجی چھاؤنی کے انتہائی حساس علاقے میں آ گئے ہیں۔ تھوڑی دیر انتظار کے بعد میئر صاحب اپنے کمرے سے باہر آئے اور ہمیں بڑے تپاک سے خوش آمدید کہا۔ اور تقریباً فوراً ہی پوچھ بیٹھے۔ آپ کے ہاں تعلیم یافتہ افراد کا فی صد تناسب کیا ہے؟ ہمارے ساتھ آنے والے پاکستانی سفارت خانے کے کونسلر نے فوراً جواب دیا ''چھتیس فی صد''۔ یہ تو پھر بہت ہی کم ہے۔ میئر صاحب فرمانے لگے۔ ''لیکن ہمارے ہاں خواندگی کا تناسب اس سے کہیں زیادہ ہے کیونکہ ہر مسلمان بچہ قرآن کی عبارت پڑھنے کی خاطر ضرور حروف تہجی سیکھتا ہے'' ہمارے سفارت کار فرمانے لگے۔ یہ جواب میئر صاحب کے پلے پڑا یا نہیں یہ ہم معلوم نہ کر سکے۔ لیکن ایک بات ضرور معلوم ہوئی کہ کورین قوم تعلیم کو کتنی اہمیت دیتی ہے۔ سیول میں قیام کے دوران ہم نے کئی مقامی باشندوں سے مقامی درسگاہوں میں اپنے بچوں کے داخلے میں پیش

---

[1] بحوالہ وِکی پیڈیا ڈاٹ کام

آنے والی مشکلات کا سُنا۔ جہاں مقابلے کی صورت حال یہ ہوتی ہے کہ بچوں کی اکثریت اوئل عمر ہی میں نظر کا چشمہ لگانے لگتی ہے اور اچھی درسگاہوں میں داخلہ نہ ملنے کے سبب کئی بچے خودکشی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ویسے سیول اچھی درسگاہوں اور جامعات کیلئے اپنی ایک شہرت رکھتا ہے۔

سیول کے بازار اور خریداری کا انوکھا انداز:

روایتی طور پر پرانے شاہی خاندان ''جوسیون'' کے آباد کردہ حصۂ شہر کو سیول کا دل سمجھا جاتا ہے۔ یہ علاقہ محلات، سرکاری دفاتر، بڑے ہوٹلوں اور روایتی بازاروں سے آباد ہے۔

سیول کا ورلڈ ٹریڈ سینٹر ''گنگ نام'' ضلع کے حدود میں واقع ہے جہاں اکثر نمائشوں اور بین الاقوامی کانفرنسوں کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ اِسی خطے میں عالمی تنظیم ڈاک کی اکیسویں سیول کانگریس کے اجلاس منعقد ہوئے۔ بعد میں ہم نے سیول کے متعلق ایک مضمون لکھا جو اُس سال کے پاک پوسٹ کے شمارے میں نامہ بروں کی معلومات کی خاطر شائع کیا گیا۔ [1] سیول کا اولیمپک سٹیڈیم، اولیمپک پارک اور دنیا کا سب سے بڑا تفریحی پارک ''لوٹ ورلڈ'' سونگ پا گو میں واقع ہیں۔ یہ علاقہ کنگ نام گو کے جنوب میں آتا ہے۔ آج سیول بلند و بالا سکائی سکریپرز کا شہر ہے اور اس کی اہم عمارات میں کورین فائننس بلڈنگ، شمالی سیول ٹاور، ورلڈ ٹریڈ سینٹر اور ٹاور پیلیس قابل دید ہیں۔ شہر کے مختلف حصوں کو آٹھ عدد زیرِ زمین رابطوں سے جوڑا گیا ہے جس کی کل لمبائی 250 کلومیٹر بتائی جاتی ہے۔ تاریخی طور پر ایک اہم سٹریٹ ''جونگنو'' کہلاتی ہے جس کے معنی گھنٹہ گھر کا محلّہ بتائے جاتے ہیں۔ ماضی میں جب یہاں کی ایک بارہ دری میں واقع گھنٹہ بجایا جاتا تھا تب ہی شہر کے آٹھ دروازے کھلوائے یا بند کیے جاتے تھے۔

سیول دنیا کے چند اہم بین الاقوامی پھیلاؤ رکھنے والے بڑے بڑے کارپوریشنز کے مرکزی دفاتر کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ ان میں سام سونگ، ایل جی گروپ، ہینڈائی، کیا موٹرز اور ڈائیو وشامل ہیں جنوبی کوریا کی 63.2 فیصد جی ڈی پی سروسز سیکٹر سے ہی وصول ہوتی ہے اور یہاں کی مشہور برآمدات میں برقی سامان۔ گاڑیاں اور مشینری شامل ہیں اس لحاظ سے سیول دنیا کی پانچ سو بڑی بین الاقوامی کمپنیوں میں سے لا تعداد کا مرکز ہونے کی حیثیت سے دنیا کا پانچواں بڑا شہر ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کوریا کے عظیم پڑوسی ملک جاپان کے کارخانے جو بھی نئی چیز ایجاد کرتے ہیں کورین فوراً اُس کی نقل مگر اُس سے بہتر انداز میں پیش کر دیتے ہیں۔

بازاروں میں شاذ ہی کوئی اچھی طرح انگریزی بولنے یا سمجھنے والا ملتا تھا۔ ہمارے دوست سعد شریف اور ضیاء

---

[1] ''اے وزٹ ٹو کوریا'' پاک پوسٹ شمارہ دسمبر 1993

الرحمٰن جب بھی فرصت کا وقت پاتے ہمیں ساتھ لے کر اپنی انگریزی خراب کرنے میں مصروف ہو جاتے۔ کسی بھی سٹور پر کوئی چیز پسند آتی تو سعد بولتے ''گڈ پرائز'' یعنی اِس شے کی مناسب قیمت لگاؤ۔ سیلز گرل اپنے ہاتھ میں موجود کیلکولیٹر کی مدد سے قیمت بتاتی۔ سعد اور ضیاء اپنے دائیں ہاتھ کو اپنے جسم کے ساتھ لگا کر اوپر سے نیچے لے جاتے جس کا مطلب یہ ہوتا کہ کم کرو۔ خاتون محترمہ اُسی انداز میں اپنا ہاتھ اپنے نیم عریاں بدن کے ساتھ لگا کر اوپر کو لے جاتیں یعنی آپ اپنی قیمت بڑھایئے۔ یوں ہاتھ اوپر نیچے کرتے کرتے اور کیلکولیٹر کے ہندسوں کو دو چار دفعہ بدلتے ایک قیمت پر سمجھوتہ ہو جاتا۔ سعد فرماتے او کے یعنی ''ٹھیک'' ہے اور آگے سے سیلز گرل بھی مسکرا کر ''اوکے'' کہہ دیتیں۔ اور یوں اِس قسم کی اشاروں کنایوں کی بین الاقوامی زبان میں اچھی خاصی خریداری ہو جاتی لیکن یقین کریں کورین دُکاندار آپ کو مایوس جانے نہ دیتا۔

کورین سرکار کی جانب سے اعلیٰ ترین نوکر شاہی کی تربیت کے لئے مختص تربیت گاہ [1] میں ہمیں وہاں کے انتظامی ڈھانچے اور طریقہ کار کے بارے میں معلومات فراہم کی گئیں۔ اِس تربیت گاہ میں موجود سہولیات نے ہمیں بڑا متاثر کیا جہاں ہر چیز مکمل طور پر خودکار طریقے سے پیش کی جا رہی تھی۔ حتیٰ کہ بجلی کا بٹن دباتے ہی آڈیٹوریم کی کھڑکیوں اور دروازوں کے سارے پردے بیک وقت سرکنے لگتے۔ اِسی آڈیٹوریم میں اور اِسی طرح دوسری اہم عمارات میں لگی ہوئی پینٹنگز کا ایک خاص موضوع جاپانیوں کے مظالم اور اُن کے قومی برتری کے دعوؤں پر مبنی نظر آیا۔

موجودہ دور میں جنوبی کوریا کی صنعتی اور مادی ترقی کے متعلق ایک دنیا جانتی ہے لیکن اِس کی ایک جھلک دکھانے کے لئے ہمیں ایک دوسرے شہر میں منعقد ہونے والے بین الاقوامی میلے پر جانا پڑا۔ تیز رفتار مگر آرام دہ نشستوں والی ریل کے سفر کے دوران ہم نے سیول جیسے بڑے شہر سے باہر کی دنیا بھی دیکھی۔ مختلف ممالک کے سٹالز یوں تو سب ہی دلچسپ تھے لیکن وہاں پاکستان کے سٹال پر پاکستانی مصنوعات یعنی قالینوں اور سنگِ مرمر سے تراشیدہ اشیاء کو دیکھ کر یقیناً خوشی ہوئی۔ ہمارے گروپ کے شرکاء اِس بات سے واقف تھے کہ جمہوریہ کوریا کی یہ قابلِ دید ترقی وہاں کی بروقت اور درست سمت میں منصوبہ بندی کی بدولت ممکن ہو سکی ہے اور یہ بات بھی ہم سب پر عیاں تھی کہ یہاں کا پہلا پانچ سالہ منصوبہ حکومت پاکستان کی مدد سے ہی بنایا گیا تھا جس میں پاکستان کے ڈاکٹر محبوب الحق کا کردار نہایت اہم تھا اور خود کوریّن اس کا اعتراف بھی کرتے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے ہم اپنی ترقی کی رفتار برقرار نہ رکھ سکے جبکہ اُس قوم نے اپنی منصوبہ بندی پر نہایت سنجیدگی سے عمل درآمد کرایا۔ ہمارے ہاں کے غیر سنجیدہ رویّوں کی ایک چھوٹی سی مثال تو ہم نے اپنی آنکھوں دیکھی۔ اتفاقاً

---

[1] سنٹرل آفیسرز ٹریننگ انسٹیٹیوٹ (CDTI)

اُن ہی دنوں ڈاکٹر محبوب الحق صاحب عالمی بینک کی ملازمت سے فارغ ہو کر پاکستانی کابینہ میں شامل ہو گئے تھے۔ اور کافی عرصے تک بطور وزیر قومی منصوبہ بندی اور مالیات کے خدمات انجام دیتے رہے۔ اُنہوں نے ایک سال بجٹ کا اعلان کرتے ہوئے سرکاری ملازمین کی تنخواہوں کے ضمن میں ارشاد فرمایا کہ آئندہ سے حکومت پاکستان اپنے ملازمین کی تنخواہوں میں اضافے کو افراطِ زر کی شرح سے منسلک کر دے گی۔ اگلے سال اس اعلان پر کوئی عمل نہ ہوا۔ سٹاف کالج کورس کے دوران ہم لوگ اسلام آباد گئے تو اُن سے بھی ملاقات ہوئی۔ اقتصادی ترقی کے اہداف اور حکومتی منصوبہ بندی کے بارے میں تفصیلی گفتگو ہوئی۔ میں نے اُنہیں تنخواہوں کے متعلق اُن کے سابقہ اعلان کا حوالہ دیا تو فرمانے لگے۔ حکومت اِس بارے میں قطعی فیصلہ کر چکی ہے اور ہم آئندہ سال سے افراطِ زر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہی تنخواہوں میں اضافہ کریں گے۔ اگلے سال نہ اُن کی حکومت رہی نہ ہی یہ وعدہ ایفا ہو سکا۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں ہر نئی حکومت گذشتہ حکومت کو سب خرابیوں کی ذمہ دار ٹھہراتی ہے اور یوں حکومتی فیصلوں میں بمشکل ہی تسلسل دیکھنے میں آتا ہے۔

کوریا میں تربیتی اداروں میں انصاف، حب الوطنی، آزادی سے لگن اور اپنے مستقبل میں یقین پر زور دیا جاتا ہے۔ زور تو ہمارے ہاں بھی بہت کچھ پر دیا جاتا ہے لیکن شاید ہمارے ہاں خلوص میں کمی کے باعث محض گفتار کے غازی ہی بنے رہتے ہیں اور کوریا جیسے ہم سے ایک تہائی آبادی والے ممالک کردار کے غازی بن بیٹھے۔ اِس کی ایک وجہ تو ہمارے ہاں کی شرح آبادی ہے جو 2.9 فی صد بتائی جاتی ہے جبکہ کوریا میں یہ شرح صرف 0.9 فیصد ہے۔ لیکن بچوں کی شرح اموات یہاں 94 فی ہزار ہے تو وہاں صرف 9۔ خواندگی کا تناسب اُس سال تک پاکستان میں 36 فی صد تھا تو کوریا میں 96 فی صد سے بڑھ کر۔ [1]

دریائے ''ہان'' کے طاس میں واقع سیول کا شہر آٹھ عدد مہیب پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے لیکن اِس کے باوجود ذرائع آمد و رفت جہان بھر میں مثالی بنائے گئے ہیں۔ کورین قوم کی شاید سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ سیول سے محض پچاس میل شمال کی طرف وہ خط فیصل واقع ہے جس نے اِس باہمت قوم کو دو حصوں میں بانٹ رکھا ہے اور یوں بین الاقوامی سیاست کے بھینٹ چڑھ کر بھائی سے بھائی جدا ہے۔

---

[1] بحوالہ ''ایشیا ویک'' اکتوبر 13۔1993